تعارفِ کُتب

مجموعۂ قوانینِ اسلام، جلد دوم | مصنف: تنزیل الرحمٰن صاحب ایڈووکیٹ۔ ناشر: ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی، طارق آباد، راولپنڈی ضخامت ۴۲۱ صفحات قیمت ۱۵ روپے۔

اس کتاب کی پہلی جلد اس سے قبل شائع ہو چکی ہے اور ترجمان میں اس پر تبصرہ بھی ہو چکا ہے۔ اب یہ دوسری جلد شائع ہوئی ہے جو طلاق، خلع، تفریق، ایلاء، ظہار اور لعان سے متعلق اسلامی قوانین کو دفعات کی شکل میں پیش کرتی ہے اور مختلف فقہی مسالک و آراء سے تفصیلی بحث کرتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مؤلف نے حسبِ سابق بڑی محنت اور دِقتِ نظر سے اس جلد کا مواد جمع اور مرتب کیا ہے۔ ایسی ضخیم اور اہم کتاب کے تفصیلی تعارف و تبصرہ کے لیے خاصا اہتمام اور وقت درکار ہے۔ سرِدست پوری کتاب کو ایک نظر دیکھنے کے بعد چند مقامات جو محلِ غور و نظر اور اصلاح طلب محسوس ہوئے ہیں، انہیں یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

طلاق مکرہ کی بحث کے ضمن میں ص ۲۷ پر ایک دفعہ ۱۶۲ کا عنوان ہے: "طلاق مکرہ کا اقرار"۔ دفعہ کی عبارت یوں ہے: "طلاق مکرہ کا اقرار خواہ زبانی ہو یا تحریری، غیر نافذ ہوگا"۔ اس دفعہ کا عنوان اور اس کے متن کی عبارت دونوں صحیح نہیں ہیں۔ ان کے پڑھنے سے شبہ ہوتا ہے کہ مسئلہ زیرِ بحث یہ ہے کہ جو شخص جبر و اکراہ کا شکار ہو کر طلاق دے بیٹھا ہو، وہ طلاق دینے کے بعد اگر اس کا اقرار کرے، تو یہ اقرار غیر موثر اور ناقابلِ تسلیم ہوگا۔ حالانکہ مؤلف جس جزئیے کو بیان کر رہے ہیں، وہ یہ ہے کہ کوئی شخص اگر مجبور ہو کر یہ اقرار کرے کہ میں نے طلاق دی ہے (اور فی الواقع اس نے نہ دی ہو)، تو یہ زبردستی کا حاصل کیا ہوا اقرارِ طلاق نافذ نہ ہوگا۔ یہ دفعہ دراصل بالجبر حاصل کردہ طلاق سے متعلق نہیں، بلکہ بالجبر حاصل کردہ اقرارِ طلاق سے متعلق ہے، جیسا کہ مؤلف کی اپنی تشریح سے واضح ہے۔ اس لیے دفعہ اور عنوان کے الفاظ کا بدلنا ضروری ہے۔

چودھویں باب میں خلع و مبارات کے مسائل پر بحث کرتے ہوئے مؤلف نے بجا طور پر یہ واضح کر دیا ہے کہ فقہائے حنفیہ کے ہاں ازالہ نکاح کی جس صورت پر خلع کا اطلاق ہوتا ہے، اُس میں یہ ضروری ہے کہ خاوند "خلع" یا اس کے ہم معنیٰ الفاظ استعمال کرے۔ اس لیے خلع کے جو مقدمات عدالتوں میں جاتے ہیں، ان میں اگر عدالت تفریقِ نکاح بذریعہ خلع چاہے، تو خاوند سے خلع کے الفاظ کہلوانا لازم ہیں۔ لیکن اس بحث میں دو امور کی وضاحت پورے طور پر نہیں کی گئی۔ پہلی اہم بات جو قابلِ ذکر تھی، وہ یہ ہے کہ احناف کے نزدیک خلع میں قضائے قاضی شرط لازم نہیں۔ بعض دوسرے فقہاء کا قول بھی اسی کے مطابق ہے۔ شریعت میں یہ امر پسندیدہ نہیں ہے کہ میاں بیوی کا ہر جھگڑا عدالت تک پہنچے اور عدالت ہی فیصلہ دے۔ اس سے مرد عورت دونوں کی شہرت داغدار ہوتی ہے۔ البتہ زوجین یا حکمین کی باہمی مساعی کے باوجود اگر نباہ یا طلاق یا خلع کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکے تو پھر عدالت کی مداخلت ناگزیر ہو گی۔ ہمارے ہاں جس طرح خلع، طلاق بالمال اور عدالتی تفریق کو باہم خلط ملط کر دیا جاتا ہے اور جس طرح عائلی معاملات کو خواہ مخواہ عدالتوں سے وابستہ و معلق کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، یہ رجحان اسلامی نقطۂ نظر سے غیر مطلوب ہے۔

دوسری ضروری بات جو یہاں قابلِ تصریح تھی مگر جس کی صراحت نہیں کی گئی، وہ یہ ہے کہ فقہائے حنفیہ، مالکیہ اور بعض دیگر ائمہ مجتہدین کے نزدیک خلع کی تنفیذ و تکمیل کے لیے عورت کی قبولیت شرط ہے۔ خاوند اگر خلع کر بھی دے مگر بیوی اسے منظور نہ کرے اور مالی بدل ادا کرنے پر آمادہ نہ ہو، تو نکاح قائم رہے گا۔ (البتہ خلع میں اگر مالی عوض یا بدل کا سرے سے ذکر ہی نہ ہو، تب مرد کا خلع طلاق کے مانند فوراً نافذ ہو جاتا ہے)۔ فقہائے کرام کا یہ اجتہاد گہری دینی بصیرت پر مبنی ہے اور یہ زوجین بالخصوص عورت کے حق میں بہت نافع ہے۔ خلع کا مطالبہ چونکہ بالعموم عورت ہی کی جانب سے ہوتا ہے، اس لیے مرد کی طرف سے خلع کی پیش کش کے باوجود اس معاہدے کی تکمیل کو عورت کی رضا پر موقوف قرار دیا گیا ہے تاکہ آخر وقت تک اُسے غور و تأمل کا موقع مل سکے۔ ان دو قابلِ وضاحت امور کا اگرچہ ضمناً اشارہ بلادِ اسلامیہ کے ان عائلی قوانین میں آگیا ہے، جو مصنف نے اس بحث میں نقل کیے ہیں، مگر ثبت اور واضح طور پر اصل دفعات میں ان کا بیان ضروری ہے۔

صفحہ ۱۰۱ پر "تفریق بسببِ قید" کے زیرِ عنوان ایک دفعہ درجِ ذیل ہے:

"اگر کسی شوہر کو تین سال یا اس سے زائد مدت کے لیے سزائے قید دی گئی ہو تو اس کی زوجہ بذریعہ عدالت طلبِ تفریق کی مجاز ہو گی"

ہمارے نزدیک یہ تجویز سخت فتنہ انگیز ہے اور شریعت کی تعلیمات میں اس کی گنجائش محال ہے۔ ہمارے علم کی حد تک فقہائے سلف میں سے کسی نے خاوند کی قید کو تفریقِ نکاح کے لیے جائز و معقول وجہ تسلیم نہیں کیا۔ لیکن دورِ جدید میں بعض مسلمان ممالک کی عدالتوں کو اس بنا پر تفریق کا اختیار دے دیا گیا ہے۔ پاکستان میں بھی انگریز کا بنایا ہوا ایک قانون رائج ہے جس میں سات سال کے لیے قید ہونے والے شوہر کی بیوی کو فسخ نکاح کا حق دیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مرتب سات سال کو تین سال کی مدت میں تبدیل کرانا چاہتے ہیں۔ مالکیہ اور حنبلیہ کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ وہ زوج غائب غیر مفقود کی بیوی کو تفریق کا حق دیتے ہیں لیکن اس کے لیے کوئی حوالہ درج نہیں کہ تحقیق کی جاسکتی کہ ان حضرات کی طرف قول کی نسبت کس حد تک صحیح ہے اور وہ محبوس کو بھی غائب کی صف میں شامل کرتے ہیں یا نہیں۔ حنفیہ زوج غائب کی منکوحہ کو تفریق کا حق نہیں دیتے۔ تاہم ولایتِ نکاح کی بحث میں انہوں نے ولیٔ غائب کی مختلف تعریفات بیان کی ہیں۔ امام سرخسیؒ نے مبسوط میں غیبتِ منقطعہ کی صحیح ترین تعریف یہ دی ہے کہ اس سے مراد ولی کا ایسے دور افتادہ مقام پر ہونا ہے کہ اگر اس کی آمد یا اس کی رائے کی وصولی کا انتظار کیا جائے تو موزوں اور ہم کفو رشتہ ہاتھ سے نکل جائے۔ ایک قول یہ ہے کہ غائب کا اطلاق اس پر ہوتا ہے جس کا ٹھیک اتہ پتہ نہ مل سکے (لا یوقف علی اثرہ . . . لا یعرف خبرہ)۔ بہر کیف اگر زوج غائب سے مراد ایسا شوہر لیا جائے جو کسی اجنبی دیار میں جا پہنچا ہے جس سے خط و کتابت، اور ملاقات نہ ہو سکتی ہو، اور جس کی مدت قیام بھی غیر معین اور بہت طویل ہو، تو ایسے شخص کی بیوی کا مطالبۂ تفریق قابلِ غور ہو سکتا ہے۔ لیکن ہر وہ شخص جو چند سال کے لیے اپنے ہی ملک کی جیل میں چلا جائے اُسے غائب فرض کر لینا اور اس کی بیوی کو تفریقِ نکاح کا پروانہ دے دینا شرعاً و عقلاً بے جواز ہے۔

ایسی تجاویز پیش کرنے والوں کو شاید معلوم نہیں کہ ہمارے فقہاء نے اسیروں کے حقوق میں اس حق کو بھی شامل سمجھا ہے کہ وہ اپنے اہل و عیال سے تخلیہ میں ملاقات کر سکیں اور کچھ دن ان کے پاس رہ سکیں۔ اس کی یہ صورت بھی ممکن ہے کہ قیدی کو گاہے گاہے گھر پر مقیم رہنے کا موقع دیا جائے یا گھر والوں کو اجازت دی جائے کہ وہ قیدی کے پاس جا کر ٹھیر سکیں۔ اب تو دنیا بھر میں قیدیوں کے حق میں اس طرح کی اصلاحات سوچی اور نافذ کی جا رہی ہیں

اور ہمارے ملک میں بھی بعض صورتوں میں یہ رعایت دی جاتی ہے۔ اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ قیدیوں کے نکاح تڑوانے کے بجائے انہیں اپنے اہلِ خانہ سے میل جول کے مناسب مواقع مہیا کیے جائیں۔ بہت سے افراد غلط الزام اور غلط شہادتوں کی بنا پر سزا پاتے ہیں یا الزام ثابت کیے بغیر انہیں سالہا سال تک نظر بند رکھا جاتا ہے۔ ان کی بیویوں کو تفریقِ نکاح کا حق دینا شوہروں پر دوہرا ظلم ہوگا۔

صاحبِ تالیف نے تفریقِ نکاح کے جو وجوہ و اسباب بیان کیے ہیں، ان میں لعان کا بھی ذکر کیا ہے چنانچہ ص۱۴۳ پر انہوں نے ایک دفعہ کی عبارت یوں درج کی ہے: "جب زوجین حاکمِ عدالت کے رُوبرُو ایک دوسرے پر لعان کر چکیں تو حاکمِ عدالت ان میں باہم تفریق کرا دے گا۔" اس سلسلے میں انہوں نے بیان کیا ہے کہ ہمارے ہاں کی اعلیٰ عدالتوں کے بعض فیصلوں میں لعان کرانے اور اسے جائز بنائے تفریق تسلیم کرنے سے گریز کیا گیا ہے اور عذر یہ پیش کیا گیا ہے کہ ہمارے عدالتی نظام میں اسلام کا ضابطۂ شہادت نافذ نہیں اور لعان اسلامی ضابطۂ شہادت کا جزو ہے۔ فاضل مؤلف نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ لعان کی حیثیت اصل اور مستقل قانون کی ہے، نہ کہ اسلامی قانونِ شہادت کے ضابطے کی، اس لیے ہماری عدالتیں لعان کے طریقے کو تنسیخِ نکاح کا ایک عمدہ سبب قرار دیتے ہوئے، تفریقِ نکاح کی حد تک اس پر عمل کر سکتی ہیں اور جو فریق قسم کھانے پر آمادہ نہ ہو، اُسے اس وقت تک قید کر سکتی ہیں جب تک کہ وہ آمادہ نہ ہو۔

لیکن ایک آزاد اسلامی مملکت کے قانون دانوں اور قانون سازوں کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ اپنی بحث و نظر کو فقط اس امر تک محدود رکھیں کہ زوجین اور حکامِ عدالت بس تفریقِ نکاح کے معاملے میں کس طرح لعان کے اسلامی قانون سے انتفاع کر سکتے ہیں، بلکہ اس کے ساتھ ہی انہیں چاہیے کہ وہ ان تمام فوجداری قوانین کے نفاذ کا مطالبہ کریں جو اسلام نے زنا اور قذف کے سلسلے میں مقرر کیے ہیں۔ مان لیا کہ لعان محض ایک ضابطۂ شہادت نہیں، بلکہ یہ ایک مستقل بالذات قانون ہے۔ لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ اس کا گہرا اور بنیادی تعلق حدِ قذف اور حدِ زنا کے ساتھ ہے؟ تفریقِ نکاح تو محض ایک ثمرہ اور نتیجہ ہے جو لعان سے صرف اس صورت میں برآمد ہوتا ہے جب فریقِ ثانی فریقِ اوّل کو جھٹلاتے، ورنہ لعان کا اصل مقصود یہ ہے کہ الزامِ زنا کے اثبات کے لیے جو نصابِ شہادت عام حالات میں مطلوب ہے اور جس کی عدم موجودگی میں الزام لگانے والے پر حدِ قذف جاری ہوتی ہے، زوجین

کے لیے اس نصاب میں ترمیم و تخفیف کی جائے۔

زنا و قذف کے مکمل اسلامی قوانین کی تنفیذ کے بغیر عدالتوں میں لعان کی کارروائی عمل میں لانا اور اس سے تفریقِ نکاح کا فائدہ حاصل کرنا لاطائل بلکہ بعض پہلوؤں سے اسلامی مقاصد کے لیے ضرر رساں ہے۔ اسلامی حدود و تعزیرات کا پورا انتظام جب تک قائم نہ ہو عدالتوں میں الزامِ زنا اور اقرارِ زنا کے باعث گھریلو زندگی کے گندے پہلو خواہ مخواہ عدالتوں کے اندر دھلتے ہیں اور اشاعتِ فاحشہ کا سبب بنتے ہیں۔ تفریقِ نکاح کے لیے قانونِ شریعت اور مروج قانون میں متعدد بنیادیں موجود ہیں اور موجودہ عدالتیں انہیں سامنے رکھتے ہوئے تفریقِ نکاح کی ڈگریاں فیاضی سے دے رہی ہیں۔ اس کے بعد محض فرقتِ زوجین کی خاطر لعان کا سہارا لینے کی آخر کونسی ایسی حاجت ہے؟

ان چند تنقیدی گزارشات کے بعد آخر میں یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ جناب مؤلف نے انصاف سے کام لیتے ہوئے متعدد مقامات پر موجودہ عائلی قوانین کے خلافِ شریعت پہلوؤں کی نشان دہی کی ہے اور متبادل تجاویز اسلام کی روشنی میں پیش کی ہیں۔ مثلاً ص ۳۴۶ پر لکھتے ہیں: "طلاق جوں ہی دی جاتے، اس کو واقع قرار دیا جاتے، نہ کہ اس کا وقوع چیئرمین کو نوٹس دینے اور نوے دن گزرنے پر موقوف ہو"۔ ص ۳۵۴ پر لکھا ہے:

"شرع اسلام نے نفاذِ طلاق کو حکم حاکم پر موقوف نہیں رکھا، جب کہ بعض حضرات طلاق کے نافذ ہونے کا فیصلہ حکم حاکم پر موقوف رکھنا چاہتے ہیں۔ . . . حقیقت یہ ہے کہ بلا حکم حاکم نفاذِ طلاق میں بڑی حکمتیں پوشیدہ ہیں . . ." اسی طرح ص ۵۶۳ سے ص ۵۶۸ تک انہوں نے رائج الوقت طلاق کے قانون پر مدلل تنقید کی ہے اور اس سلسلے میں جسٹس وحید الدین احمد صاحب کے ایک فیصلے سے بھی اظہارِ اختلاف کیا ہے جس میں انہوں نے ایک طلاق محض اس بنا پر غیر نافذ قرار دے دی کہ اس کی اطلاع چیئرمین کو نہیں دی گئی، حالانکہ اس طلاق کی ایک نقل عدالت میں پیش کی گئی اور شوہر نے زبانی بھی کہا کہ میں نے زوجہ کو طلاق دے دی ہے۔ ہم اس معاملے میں مؤلف سے کاملاً متفق ہیں اور ہماری رائے بھی یہی ہے کہ اگر فیصلہ اسی طرح ہوا ہے تو وہ کتاب و سنت سے صریحاً متصادم ہے۔ آگے چل کر ص ۵۷۰ پر اس بات کو دہرایا گیا ہے کہ یہ کہنا کہ چیئرمین کو نوٹس ملنے اور نوے یوم بعد تک طلاق مؤثر نہ ہوگی، قدرت کے احکام میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کا موجب ہے۔

اس طرح کے اندراجات میں لائق موئف کی اسلامی بصیرت جھلکتی دکھائی دیتی ہے۔ بحیثیتِ مجموعی پوری کتاب میں انہوں نے جا بجا قرآن، حدیث اور فقہائے امت کے اجتہادات سے استفادہ و استدلال کیا ہے۔ گمان یہ ہے کہ اگر وہ سوئے اتفاق سے حکومت کے ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی پاکستان کے بالمعاوضہ مشیر نہ ہوتے تو جو حق باتیں انہوں نے زیرِ لبی زبان سے کہی ہیں، انہیں واشگاف انداز میں کہتے۔ پوری آزادی اور جرأت کے ساتھ موجودہ غیر اسلامی عائلی قوانین پر تنقید کرتے اور اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور اس کے ڈائرکٹر تحقیق کے بھیس میں دین کی جس طرح تحریف کر رہے ہیں، اس کا پردہ چاک کرتے۔ مگر بحالتِ موجودہ اس امر کا خدشہ ہے کہ ان کی علمی و فکری کاوشوں میں جو پہلو بھی فی نفسہٖ قدر و قیمت کا حامل ہے، وہ محض ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی کو نظرِ بد سے بچانے کے لیے تعویذ اور نظر بَٹّو بن کر رہ جائے۔

ضروری گذارش

خریداران ترجمان القرآن و ایجنٹ صاحبان کی خدمت میں گذارش ہے کہ خط و کتابت کرتے وقت اپنے نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا کریں جو کہ ان کے پتہ کی چٹ پر درج ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اپنا پتہ نہایت خوشخط اور واضح الفاظ میں معہ تحصیل و ضلع یا قریبی ریلوے اسٹیشن بھی درج ہونا چاہیے۔

ان امور کی پابندی کے بغیر دفتر کو عدمِ تعمیل کی شکایت کا ذمہ دار ٹھیرانا سراسر زیادتی ہوگی۔

مینجر ترجمان القرآن

اچھرہ۔ لاہور